بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ ماہ صدرِ مملکت نے کنونشن مسلم لیگ کی ایک مجلس سے خطاب کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی باتوں کا ذکر کیا، وہاں اسلامی قانون کے بارے میں بھی اظہارِ خیال فرمایا اور کہا کہ ہم سب کے لیے اسلام سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں اگر اس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہو سکیں تو ہم سب کو بیحد اطمینان اور خوشی ہوگی لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے اور اس کے حل کے لیے ضروری ہے کہ علماء و وکلاء اور جج صاحبان عوام کے مشورے سے کوئی ایسا قابلِ عمل مسودۂ قانون تیار کر دیں جو تمام فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اسمبلیاں اس کی منظوری دے دیں تو میں آنکھیں بند کر کے اس پر دستخط کر دوں گا۔ اور مجھے اس سے زیادہ کسی اور بات سے خوشی نہ ہو گی کہ پاکستان میں مکمل طور پر شرعی قانون کا نفاذ عمل میں آئے۔

صدر صاحب نے اس بیان میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے دل و جان سے آرزومند ہیں۔ بشرطیکہ ملک کے تمام طبقے، مذہبی فرقے اور قانون ساز ادارے کسی مجموعۂ قوانین پر سو فیصد متفق ہو کر صدر صاحب کی بارگاہِ عالیہ میں یہ عرض کر دیں کہ حضور ملک کی سو فیصد آبادی اس مسودۂ قانون پر مکمل اتفاق رکھتی ہے لہٰذا اب آپ بھی اس پر صاد فرما کر اس کا نفاذ کر دیں۔

صدر صاحب سے بصد احترام پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا دنیا میں کہیں بھی قانون سازی کا یہ انوکھا طریقہ اپنایا گیا ہے؟ اگر قانون کے نفاذ کا یہ طریقہ کہیں بھی رائج نہیں تو آخر اسے اسلامی قانون ہی کے معاملے میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟ پھر صدر صاحب سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا آپ نے اپنے پسندیدہ دستور اور اپنے تجویز کردہ قوانین کو اسی طرح کی انہی شرائط کے ساتھ ملک میں نافذ فرمایا ہے؟ کیا ان کے نفاذ سے پہلے ان کے بارے میں تمام طبقوں سے

استصواب کر کے اس امر کا اطمینان کر لیا گیا تھا کہ ملک کی پوری آبادی ان پر کامل اتفاق رکھتی ہے؟ کیا ان پر علماء اور وکلاء اور جج صاحبان کی مہرِ تصدیق ثبت کروا کر اس ملک پر مسلط کیا گیا تھا؟ آخر آپ نے اپنے پسندیدہ دستور اور قوانین کے نفاذ میں ان ساری شرائط کو کیوں یکسر نظر انداز کر دیا؟

عوام کے حافظے بلاشبہ کمزور ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان سے ابھی تک اس آمرانہ طریق کے نقوش محفوظ ہیں جس کے مطابق ۱۹۶۲ء کے دستور کا نفاذ کیا گیا۔ اتنی بات تو بہرحال انہیں یاد ہے کہ آپ نے تشکیل دستور کے ابتدائی مراحل سے لے کر اس کے نفاذ تک عوامی احساسات کی کسی مرحلے پر بھی قطعاً کوئی پروانہ کی اور اپنے ذاتی نظریات دستور کی صورت میں عوام پر ایک حکم کے ذریعے ٹھونس دیئے۔
دستوری کمیشن کو ترتیب دیتے وقت عوام سے کسی قسم کا کوئی مشورہ نہ کیا گیا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ اپنی پسند کے آدمیوں کو اس میں شامل کیا جائے۔ اس کمیشن نے جو سوال نامہ جاری کیا اس کے جوابات بھیجنے کے معاملے میں عوام پر عجیب و غریب پابندیاں عائد کی گئیں۔ ان میں سے ایک پابندی یہ تھی کہ اس سوالنامہ کا جواب دینے میں ایک دوسرے سے مشورہ نہ کیا جائے اور اس کے کسی پہلو پر پبلک میں گفتگو نہ کی جائے بلکہ جن خوش نصیبوں کو یہ سوال نامہ وصول ہو وہ بھی اپنی آراء کو پوری طرح اخفا میں رکھتے ہوئے صرف کمیشن کو اپنے انفرادی خیالات سے آگاہ کریں۔
عوام کے لیے ایک نظامِ حیات مرتب کیا جا رہا تھا اور وہ بے چارے اس ساری کارروائی سے یکسر بے تعلق تھے۔ انہیں قطعاً علم نہ تھا کہ نوشتہ دستور ان کے لیے کیا فیصلے کر رہا ہے۔

اس کارروائی کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کے بارے میں حکومت اتنی چوکس تھی کہ جہاں ذرا بھی کسی نے لب کشائی کی وہیں اس سے بازپرس کی گئی۔ بعض افراد پر محض اس لیے مقدمات چلائے گئے کہ انہوں نے دستوری کمیشن کے سوالات کے بارے میں دوسرے افراد سے بات کر ڈالی۔ ان ایام میں حکومت کی پوری مشینری عوام کو دبانے میں غیر معمولی طور پر مستعد رہی۔ ان حالات میں جو دستوری سفارشات اس کمیشن نے مرتب کیں انہیں بھی بڑی حد تک نظر انداز کر کے ایک ایسا دستور تشکیل دیا گیا جس میں اقتدارِ اعلیٰ بلا شرکتِ غیرے صرف ایک فرد کے ہاتھ میں ہو اور

وہی ملک کے پُورے سیاہ و سفید کا مالک ہو اور کوئی شخص یا ادارہ اس سے کسی قسم کی کوئی باز پرس نہ کر سکے۔ دستوری کمیشن نے آئین میں جن جمہوری دفعات کی سفارش کی تھی ان سب کو اس میں سے نکال دیا گیا۔ آئین کمیشن کی تجاویز کو کس متکبرانہ انداز کے ساتھ مسترد کیا گیا اس کا اندازہ اس کمیشن کے صدر جناب جسٹس شہاب الدین کے حالیہ بیان سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ ان کی سفارشات کو قطعاً درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ خصوصاً ان کے ان حصوں کو تو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے جن میں صدر مملکت کے اختیارات محدود ہوتے ہوں یا عوام کے سامنے مسئولیت کا سوال پیدا ہوتا ہو۔

یہ آمرانہ روش اور عوامی احساسات سے یکسر بے پروائی کا انداز تدوینِ دستور کے مراحل تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آرڈی ننس کی تلوار کے ذریعہ اس کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اس اہم اور نازک موقع پر کسی طبقہ سے بھی مشورہ کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اور یکایک یہ قلادہ لوگوں کی گردنوں میں ڈال دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی متعدد دوسرے آرڈی ننس بھی نافذ کیے گئے تاکہ ساری قوم کو اچھی طرح جکڑ کر اس پر اس ناروا بوجھ کو لاد دیا جائے اور وہ نہ تو جنبش کر سکے اور نہ فریاد کر سکے۔ یونیورسٹی آرڈی ننس اور پریس آرڈی ننس اس دستور کے لازمی ضمیمہ کے طور پر اس کے ساتھ ہی نافذ کیے گئے تاکہ کسی طرف سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکے۔ صدر مملکت اپنے دلپسند نظریات کو تو عوام کی مرضی کے علی الرغم ملک میں اس آمرانہ انداز سے نافذ کرتے ہیں، مگر اسلامی دستور کے بارے میں ملک کی سو فیصد آبادی کے مکمل اتفاق کو شرط قرار دیتے ہیں۔ قول و فعل کا اس سے بڑا تضاد اور کہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

اُن کے اس طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ انہیں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دستور عزیز ہے اور وہ اسی کے مطابق اُمورِ مملکت چلانا چاہتے ہیں۔ اسلامی دستور کے بارے میں ان کے دل میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات ہیں اور اسی بنا پر وہ اس کے نفاذ سے گریزاں ہیں۔ لیکن اُن کے خیال میں چونکہ مسلمانوں کو اس مسئلہ سے ایک جذباتی لگاؤ ہے اس لیے وہ کھُل کر اس کے خلاف کوئی بات کہنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ اسلامی دستور کے بارے میں دبے لفظوں میں اپنے شکوک کا اظہار کیا ہے اور اپنی اُلجھن کو الفاظ کے ہیر پھیر

کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک نیم مہذب معاشرے کے قوانین کو آج کل کے جدید معاشرے کے لیے کس طرح رہنما بنایا جا سکتا ہے۔

انہیں اسلامی دستور و قانون سے کتنی محبت ہے اور وہ اس کے نفاذ کے لیے کہاں تک دل کی گہرائیوں سے آرزومند ہیں، اس کے اندازے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ اسے سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے اُن دینی مسائل میں بھی عوام کے جذبات کا کہاں تک احترام کیا ہے جن پر پوری ملت کے اندر مکمل اتحاد و اتفاق ہے اور جنہیں فی الحقیقت پوری قوم کے دل کی آواز کہا جا سکتا ہے۔ عائلی قوانین کے خلاف ملک کے سارے مذہبی گروہوں اور فرقوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ کوئی ایک طبقہ بھی ایسا نہیں جس نے مذہبی اساس پر اس کی حمایت کی ہو۔ مگر اس معاملے میں مذہبی طبقوں کا مکمل اتحاد اور اُن کا پُرزور احتجاج بھی بالکل صدا بصحرا ثابت ہُوا۔ اگر مذہبی فرقوں کے درمیان افتراق صدر مملکت کے نزدیک اسلامی نظام کی راہ کا سنگِ گراں ہے اور وہ اسی بنا پر اس کے نفاذ میں متامّل ہیں تو انہیں کم از کم اسلام کی ایسی تعلیمات کو تو قانون کی حیثیت دینے میں قطعاً تامل نہ کرنا چاہیے جن کے بارے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ شراب، قمار، رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد، زنا اور دوسری بے حیائیوں کا استیصال، رشوت ستانی کا قلع قمع، یہ چند مسائل تو ایسے ہیں جن کے بارے میں امت کے کسی طبقہ کے اندر کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ آخر ان پر عمل پیرا ہونے میں کونسی چیز مانع ہے۔

اس ضمن میں ذرا آپ اُن سفارشات کے متعلق بھی اپنے طرزِ عمل پر غور کریں جو آپ کی اپنی تشکیل کردہ مشاورتی کونسل نے آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ اس کونسل نے سُود، شراب، جُوے اور فحاشی کے بارے میں نہایت واضح طور پر بعض ایسی تجاویز مرتب کیں جن کی پوری امت نے تائید کی۔ ملک کے اخبارات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ ان امور پر کونسل کی سفارشات کی ہر طبقے نے پذیرائی کی اور کسی ایک کونے سے بھی اختلاف کی کوئی آواز بلند نہ ہوئی لیکن آپ نے ان سفارشات کو بھی یا تو یکسر مسترد کر دیا یا انہیں سرد خانے میں ڈال دیا۔ اس سلسلے میں آپ کی حکومت کی طرف سے مشاورتی کونسل پر یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ وہ اپنی سفارشات کو پبلک کے سامنے نہ لائیں بلکہ انہیں

دفتری کارروائی کے مختلف مراحل میں سے گزار کر ریکارڈ آفس کی زینت بنا دیں حکومت کے اس فرمان کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کو یہ بات بھی گوارا نہیں کہ آپ کا اپنا قائم کیا ہوا ادارہ بھی کوئی ایسی بات سامنے لائے جس سے عوام کے دینی احساسات کی ترجمانی ہوتی ہو۔

صدرِ مملکت جب کبھی اسلامی دستور کا ذکر فرماتے ہیں تو مذہبی فرقوں کے اختلاف کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا کہ ان کے درمیان ساری امت میں افتراق ہی افتراق ہے اور کسی ایک معاملے میں بھی مسلمان ایک دوسرے سے متفق نہیں۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان اصولوں کی حد تک بے مثال اتفاق پایا جاتا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ فروعات میں ہے۔ صاحبِ صدر جیسا ذہین آدمی غالباً اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ دستور اور قانونی تفصیلات میں نمایاں فرق ہے۔ دستور ہمیشہ اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا جاتا ہے اور باقی قانون سازی میں جزئیات طے ہوتی ہیں۔ دستور میں فقہی جزئیات کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے چند سال بعد جب اس اختلاف کو آڑ بنا کر قوم پر لادینی دستور مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو ملک کے تمام فرقوں کے نامور علماء نے بیٹھ کر حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اسلامی دستور کے بنیادی اصول بالاتفاق طے کرکے حکومت کے سامنے پیش کر دیئے اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی نظام سے فرار کے لیے یہ عذر بالکل بے بنیاد ہے۔ ان اصولوں سے ملک کے ہر طبقے نے مکمل اتفاق ظاہر کیا۔ علماء نے اس معاملے میں جس فکری ہم آہنگی کا ثبوت دیا اُسے دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن میں سے ہر ایک کے ذہن میں اسلامی دستور کا ایک واضح اور غیر مبہم نقشہ موجود ہے جسے بیٹھ کر سب نے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ آج تک ان بنیادی اصولوں کے بارے میں کسی فرقے نے اختلاف کی قطعاً کوئی بات نہیں کہی۔ اسی اجتماع میں علمائے کرام نے یہ بات بھی طے کر دی تھی کہ ملک کا قانون شریعت کی اسی تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور قلیل التعداد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لا یعنی اُن کی اپنی فقہ کے مطابق کیے جائیں گے۔ لہٰذا شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر کوئی رکاوٹ ہو سکتی تھی تو وہ پہلے ہی دُور ہو چکی ہے اور انگریزی محاورے کے مطابق علمائے امت نے مخالفین کے بادبانوں سے پہلے مرحلے پر ہی ہوا نکال دی۔ اس بنا پر

لادینی دستور کی کشتی مذہبی اختلافات کی آڑ لے کر اب آگے نہیں بڑھائی جا سکتی۔ اسے کھینے کے لیے اب کچھ دوسرے بہانے اور عذرات تراشنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کے اختلافات اسلامی نظام کی راہ میں نہ تو کبھی پہلے حائل ہوئے ہیں نہ اب ہو سکتے ہیں۔ اسلامی دستور قریب قریب بارہ صدیوں تک مذہبی اختلافات کے باوجود مسلمان حکومتوں میں نافذ رہا اور ان اختلافات کی بنا پر کبھی بھی اس سے انحراف نہ کیا گیا۔ اس نظام کا اصل مخالف مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ ہے جو نہ صرف دینی احساسات اور عوامی جذبات سے یکسر بیگانہ ہے، بلکہ غیر مسئول اقتدار کی چاٹ نے جس کے ذائقہ کو بگاڑ دیا ہے۔ یہ طبقہ شروع ہی سے اس امر کے لیے کوشاں رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس ملک میں اسلامی نظام کی جگہ ایک لادینی دستور نافذ کیا جائے اور اسے اسلام کا گہوارہ بنانے کے بجائے مغربی طرز کی لادینی ریاست بنا دیا جائے۔ اس ناپاک مقصد کے لیے یہ شروع ہی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مگر اسے خدا کے فضل کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی عظیم اکثریت نے دین پسند گروہ کی قیادت میں اس کے عزائم کو ہر مرحلے پر ناکام بنا دیا۔ شروع ہی میں جب ان نے لادینی ریاست کا تذکرہ شروع کیا تو عوام کی طرف سے ایک چار نکاتی مطالبہ پیش ہوا، جس میں حکومت سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں اس بات کا اعلان کرے کہ ملک کا آئین کتاب و سنت کی بنیاد پر مرتب ہوگا۔ اور کوئی قانون اسلامی شریعت کے منافی وضع نہ کیا جائے گا۔ اس مطالبہ نے اتنی قوت اختیار کر لی کہ حکومت کو ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد منظور کرنی پڑی۔ ۱۹۵۰ء میں پھر مذہبی فرقوں کے اختلافات کا ذکر کر کے اسلامی دستور کی تشکیل کے کام کو تعطل میں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن علماء کرام نے اسلامی آئین کے ۲۲ بنیادی اصول طے کر کے اس مہم کو ناکام بنا دیا۔ ان اصولوں کی حیثیت اجماع کی سی ہے۔ پھر بھی یہ آویزش مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ چودھری محمد علی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں ملک کے سامنے ایک ایسا دستور پیش کیا جس میں اچھی خاصی حد تک ۳۱ علماء کرام کے طے کردہ بنیادی اصولوں کو سمونے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا دستور تھا جس پر ملک کے سارے دین پسند طبقوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور اس یقین کے ساتھ اس کی تائید کی کہ اب ملت کے کارواں نے صحیح رُخ اختیار کر لیا ہے اور وہ جلد ہی منزلِ مقصود

کی طرف بڑھنا شروع کر دیگا۔ اس میں قرآن و سنّت کو بطور اساس تسلیم کیا گیا تھا اور حکومت نے اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنایا تھا کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے معروفات کو فروغ دے گی اور منکرات کو مٹانے کے لیے مؤثر قدم اٹھائیگی۔ اس میں شہریوں کے بنیادی حقوق بھی متعین کیے گئے تھے اور اسلام کی طرف سے عائد کردہ معاشرتی اور معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا۔ پھر اس میں اقتدار کو بھی بعض ضابطوں کا پابند بنا کر آمریت کا سدِ باب کیا گیا تھا۔

جس وقت یہ دستور سامنے آیا اسی وقت سے اسے کالعدم قرار دینے کے لیے مغرب زدہ طبقے نے سازشیں شروع کر دیں اور اسی سازش کے نتیجے میں عام انتخابات سے چند ماہ پیشتر ملک میں مارشل لا نافذ کر کے اس دستور کا خاتمہ کر دیا گیا۔ صاحبِ صدر اگر چاہتے تو ۱۹۶۲ء کے نئے غیر جمہوری دستور کی جگہ ۱۹۵۶ء کا دستور بھی نافذ کر سکتے تھے جس پر عوام قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور جسے علماء کرام نے بھی قبول کر لیا تھا۔ اگر اس انقلاب کا مقصد محض سابق سیاستدانوں سے ملک کو نجات دلانا تھا تو وہ سابق دستور کو قائم رکھ کر بھی اس کام کو سر انجام دے سکتے تھے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس بساط کو الٹنے کا مقصد صرف اس دستور کو ختم کرنا تھا۔ کیونکہ سابق سیاستدانوں کی ایک معقول تعداد کو تو صدر صاحب نے سینے سے لگا لیا ہے مگر ۱۹۵۶ء کے دستور کے جمہوری اور اسلامی عناصر میں سے کسی کو بھی نئے دستور میں راہ پانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نئے دستور کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ دستور اس سابقہ دستور کی ضد میں مرتب کیا گیا ہے اور اس کا مقصد اس کی جمہوری اور اسلامی روح کو ختم کر کے ملک میں آمریت اور مغربیت کو فروغ دینا ہے۔

آج ہمارا ملک جن مصائب سے دوچار ہے اس کی بنیادی وجہ مغرب زدہ طبقے کی یہی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ مغربی نظریات اور مغربی تہذیب و تمدن کو تو وہ قوت کے بل بوتے پر اس ملک میں رائج کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام کو جو باشندگانِ ملک کی عظیم اکثریت کا متفقہ مطالبہ ہے اور جس کی خاطر پاک و ہند کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دے کر ایک الگ خطۂ ارضی حاصل کیا ہے، اسے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے برابر ٹال رہا ہے۔

اس باہمی رسہ کشی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک میں ابھی تک کوئی ایسا دستور نافذ نہیں کیا جا سکا جسے یہاں کے عوام نے خوشدلی کے ساتھ قبول کر کے اس کے مطابق تعمیرِ نو کا کام شروع کیا ہو۔ مغرب زدہ طبقوں نے یہاں ہر گمراہی کو برداشت کیا بلکہ اُسے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے پورے مواقع فراہم کیے۔ مگر اسلام کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس غیر دانشمندانہ طرزِ عمل کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ یہاں نہ تو لادینیت ہی پوری طرح مسلط ہو سکی ہے اور نہ اسلامی نظام ہی قائم ہوا ہے۔ شروع سے ملک میں تعطّل اور بے یقینی کی ایک فضا چلی آرہی ہے۔

حکمراں طبقہ اور عوام کو اس باہمی کشمکش میں مصروف دیکھ کر اور نظریاتی اعتبار سے میدان خالی پاکر اسلام دشمن عناصر نے حکومت کی محافظت میں بلکہ اس کی تائید کے ساتھ غیر اسلامی نظریات کا پرچار شروع کیا اور اس کے عبرتناک نتائج بھی اب کھل کر عوام کے سامنے آگئے ہیں۔ غیر اسلامی قوتیں اب اتنی دلیر اور جری ہو گئی ہیں کہ اس خطۂ پاک میں علانیہ اسلام مردہ باد کے نعرے بلند کیے گئے ہیں۔ بعض لوگ اب اپنی مصلحتوں کی بنا پر اس بات کا انکار کر رہے ہیں کہ یہ نعرہ بلند نہیں کیا گیا تھا۔ مگر کراچی میں سینکڑوں سننے والے کان اس کے گواہ ہیں اور سینکڑوں دیکھنے والی آنکھیں ان لوگوں کو پہچانتی ہیں جنہوں نے یہ نعرے بلند کیے تھے۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ یہ نعرے کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بلند کیے گئے یا یہ چند شوریدہ سر نوجوانوں کے وقتی جوش و خروش کا نتیجہ ہیں۔ اس سارے معاملے میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کی غلط روش نے معاملات کو کس حد تک بگاڑ دیا ہے۔ مارشل لا کے نفاذ تک اسلام دشمن عناصر اسلامی نظام کے احیاء کی کوشش دیکھ کر بڑے پیچ و تاب کھاتے رہے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے مختلف انداز سے اس نظام کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں شکوک و شبہات بھی پیدا کرتے رہے۔ مگر آج تک ان عناصر کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ اسلام کے خلاف کھل کر کوئی بات کریں۔ ان کے غیظ و غضب کا ہدف علمائے دین (ان کی اصطلاح میں "ملّا") تھے۔ وہ ان پر برستے رہے اور عوام کو یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ حقیقت میں اسلام کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کی اُس تعبیر کے خلاف ہیں جو مولوی پیش کرتا ہے۔ مگر اب بلی تھیلے سے باہر آچکی ہے اور جو لوگ اس معاملے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا تھے اُنہیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اسلام کے کتنے خیرخواہ اور

اس سے کس قدر محبت کرنے والے ہیں، اور انہیں اللہ کا دین کارل مارکس، لینن اور ماؤ کے دین کے مقابلے میں کتنا عزیز ہے؟

ان لوگوں کے کام کرنے کا تکنیک بڑا گہرا اور عیارانہ ہے۔ یہ متعدد گروہوں میں بٹ کر معاشرے میں سرایت کرتے ہیں۔

ایک گروہ آمرانہ اقتدار کے گرد جمع ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے، اور چونکہ اقتدار عوامی تائید سے محروم ہے اس لیے اسے ہر قدم پر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی بلند بانگ گروہ اس کی تعریف و توصیف کرے اور اس کی غلط اور احمقانہ پالیسیوں کو سراہے۔ یہ گروہ آگے بڑھ کر اس کی اس ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ یہ ایک طرف اسے برابر یہ باور کراتا ہے کہ تم ایک بڑے کامیاب حکمران ہو تمہارا اقبال دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ چند رجعت پسند لوگ تمہیں خواہ مخواہ بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر تمہیں ان کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیے بلکہ انہیں سختی سے دبا دینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک تو قوت کے زور سے اختلاف کی ہر آواز کو دباتا ہے اور دوسرے اِن لوگوں کے بھرّے میں آ کر من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ یہ لوگ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کو عوامی احساسات سے بالکل بے تعلق بنا دیتے ہیں۔ جلد ہی ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ اسے عوام کے جائز مطالبات میں بھی شورش اور سماج دشمن سرگرمیوں کا عکس نظر آنے لگتا ہے اور وہ ہر اس بات کو اپنے خلاف سازش سمجھ بیٹھتا ہے جو اس کی حمایت کے سوا کہی گئی ہو۔ وہ عوامی مطالبے کو خواہ وہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو پاتے استحقار سے ٹھکراتا ہے اور ہر جائز مسئلے کو اپنے وقار اور حکومت کے وقار کا مسئلہ بنا کر دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح عوام سے بے تعلقی آہستہ آہستہ عوام دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور خواہ تقریروں میں اپنے آپ کو عوام کا خادم ہی ظاہر کیا جائے مگر عملاً میں ان کے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سارے ڈرامے میں اس اسلام دشمن گروہ کی صرف یہ کوشش ہوتی ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ ہمیشہ عوام کے خلاف صف آرا رہے۔ اس فضا میں ملک کے اندر جبر و استبداد کا بڑھنا ایک فطری امر ہوتا ہے۔ پھر حکومت کی غلط بخشیوں کی وجہ سے معیشت کا توازن بھی بگڑتا ہے۔ قومی دولت کا بیشتر حصہ ایک مختصر سے طبقے کے اندر محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اکثریت زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ بلکہ

اُسے نانِ جویں بھی میسر نہیں آتی جس سے وہ جسم و روح کے رشتہ کو قائم رکھ سکے۔

دوسرا طبقہ اپنے پہلے کالم کی اس تدبیر سے فائدہ اٹھا کر امیری و غریبی کی لڑائی کے محاذ پر کام شروع کرتا ہے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ حکمران طبقے کے خلاف عوامی نفرت اور حقارت کے جذبات کو اُن اقدار کے خلاف اُبھارنے میں مصروف ہو جاتا ہے جو اس قوم کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا سرمایہ ہیں، تاکہ قوم اپنے ماضی سے کٹ جائے، اپنے افکار و نظریات سے رشتہ منقطع کرلے، اپنے دین اور ایمان سے تہی دست ہو کر فکر و احساس کے اعتبار سے بالکل آوارہ ہو جائے، یہاں تک کہ اشتراکیت کے تھپیڑے اسے جس طرف چاہیں بہا کر لے جائیں۔ یہ طبقہ سرمایہ داری کے زخم خوردہ لوگوں کا چارہ ساز بن کر سامنے آتا ہے اور انہیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔ پھر جب وہ ان کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے تو بڑی چالاکی کے ساتھ ان کے اندر الحاد کا پرچار کرتا ہے اور ان کے رِستے ہوئے زخموں پر دستِ شفا رکھنے کے بجائے ان کے دل و دماغ میں اشتراکیت کے جراثیم اتارتا ہے۔ وہ انہیں اس فریب میں مبتلا کرتا ہے کہ سرمایہ داری اور دین، دونوں ایک ہی ہیں۔ اور سرمایہ داری کی وجہ سے تم جن مصائب میں گرفتار ہو وہ درحقیقت دین کے ساتھ وابستگی کے طبعی نتائج ہیں۔ دین استحصال اور لوٹ کھسوٹ اور کمزوروں پر ظلم و زیادتی کا علمبردار ہے۔ اور دین دار طبقے سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں۔ ان نظریات کو بڑے سلیقے اور چالاکی کے ساتھ مظلوم طبقوں میں پھیلایا جاتا ہے اور وہ ان باتوں سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے حقیقی خیر خواہ دین کے حامی طبقے نہیں بلکہ اشتراکیت کے رہنما ہیں، اور ان کی اصلاحِ حال کی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ اشتراکیت کو اپنا لیا جائے اور دین اور اس کے ماننے والوں کا خاتمہ کیا جائے۔ کیونکہ "رجعت پسند" ہونے کی وجہ سے یہ لوگ ان کی معاشی فلاح کی راہ میں حائل ہیں۔

سرمایہ داری اور جاگیرداری کو یہ اشتراکی خود کس قدر لعنت سمجھتے ہیں اور اسے انسانیت کے لیے کس حد تک تباہ کن خیال کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں سرخ فوج کے نامور سپہ سالاروں کی عظیم اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو خود بڑے بڑے سرمایہ دار اور کارخانہ دار اور جاگیردار ہیں۔ جن کی اپنی زمینوں اور

کارخانوں میں مزارعین اور مزدوروں کا خون پورے جبر و استبداد کے ساتھ چوسا جاتا ہے۔ غریبوں اور ناداروں کے ان ہی خواہوں کے زیر اثر کام کرنے والے اپنے آنکھوں ہی عتاب اور اپنی محرومیوں اور انہی مظالم کا شکار پاتے ہیں جن کی وجہ سے سرمایہ داری کو قابل نفرت گردانا جاتا ہے۔ سرمایہ داری ہمارے نزدیک واقعی ایک لعنت ہے جس کا خاتمہ ضروری ہے۔ معاشرے میں معاشی عدل و انصاف فی الحقیقت انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ سرمایہ پرستی اور معاشی ناہمواری نے عوام کی زندگیوں کو ایک دردناک عذاب بنا دیا ہے۔ مگر ہم اسے دنیا کا سب سے بڑا فریب سمجھتے ہیں کہ جو لوگ خود سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں وہ اشتراکیت کے علمبردار بن کر اٹھیں اور عوام کو یقین دلائیں کہ ان کے دکھوں کا مداوا اسلام کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اشتراکیت کے ذریعہ ہی سے ہوگا۔ ہم اسے عوام کی ہمدردی کے بجائے دین کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہیں۔ اشتراکی ممالک اور "اشتراکی سرمایہ داروں" کی جو کارروائیاں اب تک منظر عام پر آتی ہیں انہیں دیکھ کر ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس تحریک کا اولین مقصد اسلام کے خلاف بغاوت ہے۔

اس ملک میں اشتراکیت کا دم بھرنے والے آخر کتنے ایسے جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں جنہوں نے اپنے عمل سے اپنے خلوص کا ثبوت دیا ہو اور اپنی زمینوں اور کارخانوں اور اپنے سرمائے کو اپنے مزارعین اور مزدوروں اور غریبوں میں تقسیم کر دیا ہو؛ یا کسی اشتراکی سرمایہ دار نے قومی فلاح و بہبود یا مزدوروں اور مزارعین کی بہتری کے لیے کوئی اولڈ ہسپتال یا مکتب قائم کیا ہو؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں کی ساری توجہ مذہب اور مذہبی طبقوں کے خلاف نفرت پھیلانے ہی میں صرف ہوتی ہے اور خستہ حال طبقوں کے مصائب دور کرنے کے لیے عملی طور پر ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جاتا؟ کیا یہ حقائق اس حقیقت کی غمازی نہیں کرتے کہ اشتراکیت کی اصل دشمنی سرمایہ داری سے نہیں بلکہ مذہب سے ہے؟ اور غریبوں اور مزدوروں کی محبت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے پیچھے اسلام دشمنی کا مذموم جذبہ پوری قوت سے کارفرما ہے۔

کتنے ہی ممالک ایسے ہیں جن میں اشتراکی انقلاب آیا اور کتنے ہی معاشرے ایسے ہیں جنہیں اشتراکیت نے زیر و زبر کیا۔ ان سب میں مذہب اور خاص طور پر اسلام کا جو حشر ہوا وہ اس تحریک کے مزاج اور مقصد و منہاج کو سمجھنے

(باقی صـ ۶۳ پر)